سٹیج بھی کروائے۔ ڈرامیٹک کلب کے تحت سٹیج کرائے گئے ڈراموں میں ''ساون رین داسفنہ'' اور ''خطرناک لوگ'' خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

شیکسپیئر کے ڈرامے Mid-Summer Night Dream کا پنجابی ترجمہ ''ساون رین داسفنہ'' کے نام سے کیا۔ Such men are dangerous کا اردو ترجمہ ''خطرناک لوگ'' کے نام سے کر کے صفدر میر اور رفیق نے ڈائریکشن دلوائی۔ یہ ڈرامے اس قدر مقبول ہوئے کہ ہر سال سٹیج کیے جاتے۔ ایک خصوصیت ان ڈراموں کی یہ بھی تھی کہ صوفی صاحب نے بطور ایکٹر بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے۔

''دلّی کی آخری شمع'' کے عنوان سے مشہور تمثیل میں برصغیر کے نامور شعراء کے نام اور کلام کو نئی نسل سے روشناس کرایا گیا۔ یہ وہ بڑا اور کامیاب کارنامہ تھا جس کی یادگار تصویر آج بھی گورنمنٹ کالج کے ہال میں زینت ہیں۔ بلاشبہ گورنمنٹ کالج کا یہ علمی و ادبی عروج کا زمانہ تھا۔ یہ دور ڈی جی سوندھی کا تھا جو پطرس بخاری سے پہلے گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل رہے۔ صوفی تبسم نے تعلیم بالغاں کے لیے ایک جریدہ ''دوست'' کے نام سے نکالا جو انہی کی ادارت میں خاصا کامیاب رہا۔

گورنمنٹ کالج میں ادیب فاضل کی شام کی کلاسیں بھی صوفی صاحب نے ہی شروع کرائیں۔ صوفی صاحب ریڈیو پاکستان کے مشیر مقرر ہوئے تو انہوں نے ریڈیو کے لیے دن رات تیزی اور مستعدی سے کام کیا۔ وہ ''علامہ اقبال ایک شعر'' پروگرام میں علامہ اقبال کے فارسی کے کلام کا ترجمہ پیش کرتے۔ یہ پروگرام بے حد مقبول تھا اور لوگ خاص یہ پروگرام صبح آٹھ بجے ریڈیو پر سنا کرتے تھے۔

انہوں نے ریڈیو فیچر اور سکرپٹ بھی لکھے۔ اس کے علاوہ وہ ٹاک لکھا کرتے تھے۔ ان کی فن میں مہارت سے ظاہر ہے کہ وہ چند لمحوں میں بڑے بڑے مشکل موضوعات کو کاغذ پر اتارتے اور اگلے چند لمحوں میں وہ الفاظ گروش کر رہے ہوتے۔ انہوں نے ریڈیو کے لیے، بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔ انہوں نے پرورہ کر بہت سی ایسی نظمیں تحریر کیں جن کو اس وقت کے مشہور گلوکاروں نے گایا، جن میں ریڈیو کے بچوں کے پروگرام کمپیئر ''شمیم آپا'' سرفہرست ہیں۔ صوفی تبسم کی نظمیں ''عذرا کی گڑیا سوئی ہوئی ہے''، ''گھنٹی بجاؤ، اس کو جگاؤ'' ریڈیو پاکستان کی لائبریری کا ایک لازوال سرمایہ ہے۔ ان کی نظموں کو ثریا بیگم، خورشید بیگم اور بہت سے فنکاروں نے بچوں کا پروگرام جو ہر اتوار کو نشر ہوتا، بچے صوفی صاحب کی نظموں کا انتظار کرتے۔ ''یہ گاؤں ہمارا یہ گاؤں ہمارا'' نے بہت خوبصورت گایا، جو آج بھی بچے شوق سے سنتے ہیں۔

''پانچ چوہے گھر سے نکلے کرنے چلے شکار، ایک چوہا باہر رہ گیا پیچھے باقی رہ گئے چار'' یہ نظم بھی بچوں کے پروگرام کے لیے ہی ریکارڈ ہوئی اور ریڈیو پاکستان کی لائبریری میں موجود ہے۔

صوفی تبسم صاحب کی غزلیں

1- وہ مجھ سے ہوئے ہم کلام اللہ اللہ

2- یہ کیا کہ اک جہاں کو کرو وقفِ اضطراب

3- کیا ہوا جو ستارے چمکتے نہیں

4- داغ دل کے فروزاں کرو دوستو

نذیر بیگم نے بھی صوفی تبسم کے بہت سے پنجابی گیت گائے اور بے حد مقبول ہوئے۔ غلام علی کی وجہ شہرت بھی حب کی غزل ہے جو انہوں نے غالب کے فارسی کلام کا ترجمہ کیا تھا۔ آج بھی مقبول ہے۔

''میرے شوق دا نہیں اعتبار تینوں، آ جا و یکھ میرا انتظار آ جا''

نسیم بیگم نے صوفی تبسم کی غزل بھی گائی۔

سو بار چمن مہکا، سو بار بہار آئی
دنیا کی وہی رونق دل کی وہی تنہائی

پاک بھارت 1965ء کی جنگ کے موقع پر صوفی تبسم کے جو نغمے ریڈیو سے نشر ہوئے، وہ پوری قوم کے عکاسی کرتے ہیں۔ یہ جنگی ترانے ریڈیو پاکستان کی تاریخ میں نہ صرف نمایاں حیثیت رکھتے ہیں بلکہ وہ ہماری ری کا حصہ بھی بن چکے ہیں۔

اے پتر ہٹاں تے نئیں وکدے
تو لبھدی پھریں بزار کڑے

چچا غلام علی

روم جانے سے پہلے اشفاق صاحب دیال سنگھ کالج میں پڑھاتے تھے۔ سید عابد علی عابد کالج کے پرنسپل تھے۔ میں کم اور محبت سے راہ لگانے پر زیادہ اصرار کرتے تھے۔ بڑی بے تکلفی سے سٹاف روم میں آ کر بیٹھ جاتے۔ سائل تک زیر بحث آتے۔ طالب علموں کے کردار، ان کی محنت اور جانفشانی کو سمجھنے اور بہتر بنانے کے لیے راستے یے جاتے۔

سٹاف روم میں اشفاق صاحب اور ڈاکٹر غلام علی (جو ابھی ڈاکٹر نہیں تھے) کی موجودگی اس میلے کی روح رواں فاق صاحب اپنی گفتگو، مزاح آفرینی، مل جل کر کھانے پینے کی روایت سے محبت کا الاؤ جلائے رکھتے۔ پروفیسر ئی خاموشی اور ذات کے حوالے سے پوری انجمن تھے۔ اس پر طرفہ تماشا یہ کہ اردو کے ادیب پروفیسر صاحب دیال ج میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ ایسا نستعلیق انگریزی لہجہ کم کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

دراز قد پروفیسر غلام علی اپنے طالب علموں کو کالج کے بعد دیر تک پڑھاتے رہتے۔ کبھی کبھی وہ باغ جناح میں کلاس لے کر چلے جاتے اور وہیں طالب علموں کو انگریزی لٹریچر سے متعارف کراتے۔ باغ جناح کی چاٹ خاں و پروفیسر غلام علی سے ہی لگی تھی۔

خاں صاحب روم سے واپسی پر جب اردو بورڈ میں ملازم تھے تو بھائی غلام علی ان کے پاس بڑی باقاعدگی سے

آیا کرتے تھے۔ ہم داستان سرائے میں منتقل ہو چکے تھے۔ عفت اپنی بیماری کے دوران ہمارے پاس قیام پذیر تھی۔ غلام علی ان کی طبیعت پوچھنے آتے لیکن انہوں نے کبھی اندر آ کر عفت سے طبیعت نہ پوچھی بلکہ باہر سے ہی بیمار پرسی کر کے چلے جاتے۔

ان کی شائستگی کا یہ عالم تھا کہ وہ بابا فضل شاہؒ کے ڈیرے پر جاتے لیکن کبھی گفتگو یا سوال جواب میں شریک نہ ہوتے۔ وہ اپنے تذبذب اپنے مسائل اپنے تک محدود رکھتے۔ بس کچھ ہاتھ باندھے سر جھکائے جیسے دعا کے لیے کر کھڑے رہتے۔ جب عفت بہت بیمار ہو کر میو ہسپتال پہنچی، Dialysis کے باوجود اس کی صحت مخدوش تھی۔ تب بھی بھائی غلام علی آتے اور نیچے نرسوں اور لواحقین سے طبیعت پوچھ کر روانہ ہو جاتے۔

عفت ان کی بیمار پرسی کے انداز سے بہت متاثر تھی۔ ہمیشہ مجھ سے کہتی "قدسیہ! کس قدر decent ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے لیے کچھ کروں لیکن میں ایک انگریزی کے پروفیسر کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔"

پتہ نہیں یہ عفت کی خیر سگالی تھی کہ اس کی دعائیں بھائی غلام علی مکہ میں پروفیسر ہو کر چلے گئے۔ ان کی اپنی دونوں بیٹیوں کے ہمراہ گئیں۔

جب خاں صاحب پہلی بار عمرہ کرنے گئے تو بھائی غلام علی نے ٹکٹ بھیجا اور انہیں اپنے پاس ٹھہرایا۔ جب یونیورسٹی چلے جاتے تو خاں صاحب سیزی اور منّی کے ساتھ پیچھے جاتے۔ ان دونوں لڑکیوں کے ساتھ ان کا پیار ہو گیا۔ خاں صاحب نے کئی عمرے کیے۔

ایک بار جب شہاب صاحب ساتھ تھے۔ صرف اس بار ہم ان کے پاس نہیں ٹھہرے۔ شہاب صاحب کہ حاضری کے دوران کم سے کم انسانی رشتوں میں Involve ہونا چاہیے۔ عموماً عمرہ بھی وہی ادا کرتے تھے۔ آخری بار کے جب میں اور خاں صاحب مکہ پہنچے تو غلام علی بھائی Edinburgh میں پی ایچ۔ ڈی کر رہے تھے۔

جب پہلی مرتبہ میں اور خاں صاحب عمرہ کرنے گئے تو مجھے سیزی کی محبت کا پتہ چلا۔ وہ میرے ساتھ طرح رہتی۔ دور سے اشارے کر کے اپنے ہونے کا ثبوت دیتی۔ ذکیہ کا معمول تھا کہ وہ ہمارے کھانے پکائے جاتی۔ منّی کبھی ساتھ چلتی کبھی پیچھے رہ جاتی لیکن سیزی نے کبھی ناغہ نہ کیا۔

مجھے اچھی طرح وہ منظر یاد ہے جب ہم خانہ کعبہ میں موجود تھے۔ یکدم کالی گھٹا کہیں سے اٹھی۔ ہر طرف ہو گیا۔ لمحوں میں موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ خاں صاحب اٹھے اور نیچے حطیم کی طرف چل دیئے۔ یہاں خانہ کعبہ سے پانی کے نکاس کے لیے ایک بڑا پرنالہ ہے۔ بارش کا پانی زور و شور سے بہہ رہا تھا۔ مجھے اور سیزی کو چھوڑ کر خاں نیچے کی طرف اترتے جا رہے تھے۔ پھر وہ پرنالے کی سیدھ میں کھڑے ہو کر اللہ کی رحمت میں خوب نہائے۔ مجھے کے گناہ ان سے جھڑ رہے ہوں۔ ایسے ہی جب ہندو لوگ گنگا اشنان کے لیے جاتے ہیں، تو انہیں احساس ہوتا جون ملی ہے اور وہ نوزائیدہ بچے کی طرح پوتر ہو گئے ہیں۔

خاں صاحب لوٹے تو ان کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ براؤن آنکھوں میں ایک چمک اور شانت سی مسکراہٹ تھی۔

''احرام نچوڑ لیں چچا۔'' سیزی نے کہا۔

''نہیں بیٹا...... ایسا پانی کب ملتا ہے، خود ہی سوکھ جائے گا۔''

''پھر گھر چلیں۔''

اب اس کا اصرار بڑھ گیا تو خاں صاحب نے ہتھیار ڈال دیئے۔

جس بار ہمارے ساتھ شہاب بھائی عمرہ کرنے لگے۔ شہاب صاحب کہنے لگے۔ ''اشفاق! تم اور قدسیہ میرے ساتھ ہوٹل میں رہو۔ بھائی غلام علی کو اس بار زحمت نہ دو۔''

''لیکن شہاب بہت خرچ ہوگا۔''

''نہیں بھائی میں ڈبل بیڈ والا کمرہ لوں گا۔ میں اور تم ڈبل بیڈ پر سوئیں گے اور قدسیہ کے لیے ایک ایکسٹرا بیڈ لگوا دیں گے۔''

اس عمرہ کے دوران مجھے پتہ چلا کہ شہاب بھائی سونے کا تو بہانہ کرتے تھے۔ پتہ نہیں رات کے کس پہر وہ چپکے سے اٹھتے اور خانہ کعبہ کے لیے روانہ ہو جاتے۔ ہم سے تو فجر کی نماز بھی پکڑی نہ جاتی تھی لیکن جب وہ غالباً اشراق پڑھ کر لوٹتے تو کبھی غلطی سے بھی ہماری اس غفلت کی طرف اشارہ نہ کیا۔ کسی شریعتی معلم کی طرح ہمیں احساس نہ دلایا کہ ہم کتنی سعادت کھو رہے ہیں۔

غالباً شہاب صاحب کا مسلک یہ تھا کہ خود اللہ انسان کو فیصلہ کرنے کی اجازت دیتا ہے تو پھر انسان کو اس فیصلے میں دخل دینے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اپنی مثال سے اگر بات کسی تک پہنچ سکتی ہے تو خیر ورنہ اجتناب ہی بہتر ہے۔

جس بار ہم اپنی ٹکٹ خود خرید کر عمرہ کرنے گئے۔ غالباً یہ ہمارا آخری سفر تھا۔ جدہ ایئرپورٹ پر ہمیں جنگی (نعیم اشفاق صاحب کے کزن ہمیں لینے آیا ہوا تھا۔ وہی ہمیں مکہ میں ایک ایسے ہوٹل میں چھوڑ گیا جو خانہ کعبہ سے بہت قریب تھا۔

اس بار بھائی غلام علی مکہ میں موجود نہ تھے۔ وہ اپنی پی ایچ۔ڈی مکمل کرنے کے لیے لندن جا چکے تھے۔ نہ سیزی تھی نہ مُنّی کی خاموش شمولیت۔ نہ واپسی پر ذکیہ غلام علی ہی کے پکے کھانے اور اس کی خدمتوں سے حظ اٹھانے کا موقعہ۔ ہوٹل کی دوسری منزل میں ایک کمرہ، غسل خانہ اور چھوٹی سی بیٹھک نما جگہ تھی جو نیچے جانے کا راستہ بھی تھا۔

ہم جب حاضری دے کر واپس لوٹتے تو راستے میں چھوٹا سا بازار ملتا جس میں ایک پاکستانی بی کلاس ہوٹل تھا۔

پہلی رات جب ہم عشا کی نماز پڑھ کر خانہ کعبہ سے لوٹے تو اس ہوٹل پر رکے۔ خاں صاحب نے کچھ سالن مانگا۔

''اور روٹی......'' خوانچہ فروش نے سوال کیا۔

''ایک روٹی......'' خاں صاحب بے دھیانی سے بولے۔

دکاندار نے میری طرف اشارہ کر کے سوال کیا۔ ''اور اس کے لیے؟''

''ہاں دو روٹیاں۔''

غالباً اس وقت خاں صاحب مکمل طور پر غائب تھے۔ انہیں میرا خیال تک نہ تھا۔

"لو......اور اس کو بھولنا نہیں۔"

ہم دونوں کھانا لے کر ہوٹل میں پہنچے۔

اسی قیام کے دوران ایک چھوٹا سا واقعہ اور بھی ہوا۔

رات کے وقت تک خاں صاحب صفا اور مروہ کے مقام پر ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی پر بھاگ دوڑ دے رہے ہوتے اور میں اس کھلے دریچے میں شانتی سے بیٹھی خانہ کعبہ کے کالے غلاف کو تک رہی ہوتی کیونکہ میری سعی بی بی ہاجرہ کر چکی تھیں اور تمام عورتوں کو اس بھاگنے سے چھٹی دلا چکی تھیں۔ مرد ہانپتے کانپتے کچھ بوڑھے Wheel Chair پر بھاگم بھاگ آ جا رہے تھے۔ تھکان کے مارے مردوں کے چہروں پر ناخوشگوار احساسات واضح عیاں تھے۔

پھر میں نے دیکھا ایک گورا چٹا نوجوان (جو غالباً لبنان یا جنوبی ترکی کا تھا) نیچے والی قطار سے اُٹھا۔ ایک کاغذی گلاس اٹھایا اور اس میں زمزم کا پانی انڈیلا۔ زمزم کا یہ پانی اور ایسے گلاس جا بجا خانہ کعبہ میں پڑے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ یہاں ایک ہی گلاس ہوا کرتا تھا۔ گویا حکم تھا کہ امت محمدیؐ میں کوئی اونچ نیچ، چھوت چھات کی گنجائش نہیں۔ سب مثلِ یک قلب اور ہزار جان ہیں۔

جب سے مغرب نے مسلمان ممالک میں اپنی ہائیجین کا تصور رائج کر دیا، ہم اسلامی صفات اور طہارت کو بھولتے جا رہے ہیں اور اسی لیے ہم بھول چکے ہیں کہ اصل صفائی اور طہارت اندرون کی ہوتی ہے۔ بیرون صرف ہے جس سے مراد ایک نظام کی تخلیق ہے جس سے موتیوں کو ایک دھاگے میں پرونے کا کام لیا جاتا ہے۔

میں آپ کو بتا رہی تھی کہ ایک نوجوان بظاہر پاکستانی نہیں لگتا تھا۔ میری طرف بڑھا۔ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف اٹھایا اور مجھے پیپر گلاس میں زمزم کا پانی بڑی محبت اور احترام سے پیش کیا۔ پانی کا گلاس دے کر وہ غائب ہو گیا۔ میری نگاہوں نے اسے تلاش کیا لیکن وہ کہیں ہوتا تو نظر آتا۔

مجھے آج تک اللہ کی اس رحمت کی سمجھ نہیں آئی۔ کبھی لگتا ہے اس گلاس کی وجہ سے میرے سارے کام سہل ہوئے۔ کبھی گمان گزرتا ہے کہ یہ گلاس اس بات کا مظہر تھا کہ میرا عمرہ قبول ہو گیا۔ کبھی خوش فہمی ہوتی کہ میرے گناہ معاف کر کے مجھے نوزائیدہ بچے کی طرح رحمت کا چشمہ دیا گیا۔

جب خاں صاحب لوٹے تو میرے ہاتھ میں گلاس دیکھ کر بولے "قدسیہ! یہ گلاس کہاں سے آیا۔ زمزم کافی نیچے پڑے ہیں۔"

میں نے واقعہ بیان کیا۔

"دیکھو اس گلاس کا دھیان رکھنا۔ ایسے واقعات عام طور پر نہیں ہوتے اور یہاں جو بھی پیش آتا ہے اس کے لیے شکر گزاری شرط ہے۔ تم اس کے معنی سمجھو نہ سمجھو احترام ضروری ہے۔"

اب میرے لیے یہ واقعہ اور بھی اہمیت اختیار کر گیا۔ واپسی پر ایک مدت میرے پاس یہ یادگاری گلاس رہا۔

ذکیہ غلام علی لاہور کالج فار ویمن میں انگریزی پڑھاتی تھیں۔ بھائی غلام علی ایڈنبرا میں پی ایچ۔ڈی مکمل کر رہے تھے دونوں چھاؤنی والے پل سے ذرا سا اترائی میں اردو بورڈ کا خوبصورت دفتر تعمیر ہوا تھا۔ اسی سڑک پر کچھ آگے ذکیہ نے زمین خرید لی، لیکن اسے گھر بنانے کا شعور نہ تھا۔ خاں صاحب نے اس کے گھر کا نقشہ اپنی نگرانی میں بنوایا۔ اسی ٹھیکیدار نے داستان سرائے اور اردو بورڈ کی عمارتیں بنائی تھیں۔ ذکیہ کا گھر بھی تعمیر کرایا۔ اس گھر کا نام بھی ''ادب سرائے'' ہے۔ اس کی تعمیر بھی خاں صاحب کی زیرِ نگرانی ہوئی۔

شاید یہ ان مہمان نوازیوں کا ردِعمل تھا جو بھائی غلام علی نے ہر عمرے کے دوران انہیں دکھائی تھیں یا شاید وہ دوستی کو جزو سمجھتے تھے کہ دوست کے کام آنا ہی سب سے بڑی دوستی ہے۔ بہرکیف اس گھر کی تعمیر کے دوران دونوں ذکیہ خاں صاحب کے بہت قریب آ گئیں۔

متی نے ادبی دنیا میں بہت نام کمایا۔ کچھ عرصہ اردو بورڈ میں نوکری بھی کی اور اب اپنی بچی کے ہمراہ وہ ''ادب سرائے'' میں ہی رہتی ہے۔

زہیر عمن علی کے نام سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ اس کی کہانیوں نے باپ کی روایت کو زندہ رکھا ہے۔ بیٹری کے ساتھ ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی چلاتی ہے اور وہ بھی ادب سرائے کا ایک لازمی حصہ ہے۔

دونوں دوست ہم سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ان دونوں کی سانجھی خوبی یہ تھی کہ دونوں ''رول ماڈل'' تھے۔ یہ بات وضاحت طلب ہے۔ ہمارے پاس ''رول ماڈل'' کے تین تصور موجود ہیں۔ ایک تصور مغرب کی سفید فام سے درآمد کیا گیا ہے۔ ایک رول ماڈل مشرق میں چین سے مستعار لیا گیا ہے اور تیسرا تصور رول ماڈل نبیؐ کی سیرت کا گروہ ہے۔

مغرب کے لوگ صرف کام کو اہمیت دیتے ہیں اور کام کرنے والے کی عزتِ نفس کا معیار اس کی کام کرنے کی صلاحیت کے تناسب سے ہے۔ اس کے بعد سارا معاشرہ بری الذمہ ٹھہرتا ہے۔ چین کا رول ماڈل باقاعدہ معاشرہ کا سند یافتہ فرد ہوتا ہے جیسے ماؤزے تنگ کے معیار پر پرکھ کر ساری قوم سر پر چڑھا لیتی ہے لیکن اس Workaholic کے اخلاق یا ذاتی خوبیوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ وہ ذاتی زندگی میں جھوٹا، فریبی، دغاباز، کیسی ہی بچی کا مظہر کیوں نہ ہو سماج میں احترام کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

نبیؐ نے جس رول ماڈل کا تصور دیا ہے، وہ نرالا ہے۔ یہاں کردار، اخلاق اور دین داری رول ماڈل بننے کے لیے شرط ہیں۔ اچھا انسان کامیاب اور کام کرنے والے انسان سے زیادہ تعریف کا مستحق ہے۔ معاشرے کو ان کی مثال سامنے رکھنی چاہیے اور آنے والی نسلوں پر اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہیے۔

جہاں تک میرا علم ہے خاں صاحب اور ان کے دوست بھائی غلام علی واقعی رول ماڈل تھے۔ ان کی اچھائی کے پس منظر میں ان کی محنت چھپی تھی اور محنت بھی وہ اس لیے کرتے تھے کہ یہی وصفِ عبودیت ہے اور یہی حکم ہے کہ رزقِ حلال محنت سے کماؤ۔

قرۃ العین حیدر

یہ ان دنوں کی بات ہے جب عینی کراچی میں انفرمیشن کی ایک بڑی افسر تھی۔ پھر یکدم پتہ چلا کہ کسی ہم نے ''آگ کا دریا'' پڑھ کر یہ رپورٹ حکومت کو دی کہ عینی تو پاکستان دشمن ہے۔ اس کی ساری وفاداریاں ہندوؤں کے ہیں اور ایسا افسر پاکستان کے دوقومی نظریئے کو گزند پہنچا سکتا ہے۔ لیجیے صاحب قرۃ العین حیدر دلبرداشتہ ہو کر ہند سدھاریں۔ اکھنڈ بھارت کے پجاریوں کو تُرپ کا پتہ ہاتھ آ گیا۔ دلّی میں ایک چھوٹا سا گھر لے لیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

یہ وہی دن تھے جب فہمیدہ ریاض بھی پاکستان بدر کر دی گئی تھی۔ اچھی بھلی وطن دوست کا ناس کر دیا۔ ایک گزر گیا۔ پھر خاں صاحب سے ملنے اچانک یہ دونوں آ پہنچیں اور اتفاق ملاحظہ ہو دونوں ایک ہی دن ایک ہی وقت روزِ قیامت ہو اور حساب کا وقت آ گیا ہو، ہمارے ہاں آئیں۔ خاں صاحب تو سوائے اپنے کسی کا حساب لینے دا نہیں۔ دونوں سے بڑی محبت سے ملے۔

وہ شام بڑی سلونی مٹھلونی تھی۔ خاں صاحب کے ایک طرف عینی اور دوسری جانب فہمیدہ بیٹھی ہوئی تھی سے پہلے میں نے قرۃ العین حیدر کو قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی کچھ محجوب نظروں سے مجھے تک رہی تھی۔

''اشفاق یہ تمہاری بیوی بھی لکھتی ہے۔''

''آپ کو پتہ نہیں۔ انہوں نے ''راجہ گدھ'' لکھی ہے۔'' فہمیدہ بولی۔

''ارے بھئی میری نظر سے تو نہیں گزری۔''

''کتاب لا کر دو قدسیہ۔'' خاں صاحب نے نرمی سے آرڈر کیا۔

میں بھاگ کر ''راجہ گدھ'' لے آئی اور عاجزی سے عینی کو پیش کی جس طرح نئے لکھنے والے اپنی کتاب بڑے لکھنے والوں کی خدمت میں حاضر کیا کرتے ہیں۔

عینی نے کتاب رکھ لی۔ کافی دیر کے بعد ایک روز مجھے خاں صاحب نے بتایا۔

''بھئی تم بہت Lucky ہو۔ عینی نے تمہاری کتاب پڑھ بھی لی ہے اور اسے پسند بھی کیا ہے۔ یہ بہت ہے۔ ''آگ کا دریا'' لکھنے والی کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ ''راجہ گدھ'' پڑھے۔''

نیلے رنگ کی پھولدار ساڑھی، چہرے پر خوبصورت چشمہ، پیروں پر کیوٹیکس کے پرانے نشان بغیر ہیل کے جوتی عینی کا وجود آج بھی بڑی صفائی سے میرے سامنے جھلملاتا ہے۔ عینی اور خاں صاحب فون پر رکھتے تھے اور ایک دوسرے کو خط بھی لکھتے تھے لیکن میں اس بے تکلفی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

مفتی جی

مفتی جی کے متعلق میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ ان کے جانے سے کس کا نقصان ہوا..... خاں صاحب

ہے؟...... کہ میرے بچوں کا؟ ہم سب الگ الگ عجب غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ ہم انہیں مہمانوں، رشتہ داروں، گھر کے ساتھ شیئر ضرور کرتے تھے لیکن دعویٰ ملکیت اپنی اندر کی جیب میں صرف اپنے لیے محفوظ رکھتے تھے۔ ہم نے کبھی کو بھی اس کا دعویدار نہیں سمجھا۔

1947ء میں جب مفتی جی بٹالہ شہر سے ہجرت کر کے لاہور آئے تو انہوں نے سب سے پہلے والٹن کے رفیوجی ملازمت کی۔ اس وقت لوگ اپنے خاندانوں سے بچھڑ کر اس کیمپ میں جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ اس بچھڑے ہوئے لوگوں کی کھوج، ان کے ٹھکانے اور دکھ سکھ میں شریک ہونے اور کرنے کے لیے اپنوں کی تلاش تھی۔ مفتی جی یہاں پر افسر رابطہ لگ گئے۔ ان کے ہاتھ میں مائیکروفون رہتا۔ وہ پکار پکار کر لوگوں کے نام بتاتے رہتے۔ ان کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ خاں صاحب بھی کلرک بھرتی ہو کر والٹن کیمپ جا پہنچے۔ نئے ملک کے ساتھ یہ ایک نیا سفر تھا۔

پرانی یادیں اندر والی جیب میں دل کے ساتھ محفوظ کر کے پٹی کس کے مفتی جی اور خان صاحب کام کر رہے تھے۔ مفتی جی مجھے تو گورداسپور سے جانتے تھے، جہاں میری خالہ گورنمنٹ ہائی سکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں اور مفتی جی اپنی بچی کو داخل کروانے کے لیے لائے تھے۔ میری ان کی واقفیت سرسری تھی کیونکہ قیام پاکستان کے بعد نارمل اتھل پتھل ہو گئیں اور پرانے رابطوں کو مضبوط کرنے کے لیے وقت نہ ملا۔ لیکن اشفاق صاحب سے تو پہلی بار مفتی جی کیمپ میں ہی ملے۔

مفتی جی چہرہ شناس تو تھے ہی، جوہری کی سی نظر سے پتھر اور جوہر میں حد فاصل قائم کر لیتے۔ کچھ ہی دنوں کے اندر خاں صاحب کی ادب نوازی کا مفتی جی نے مکمل جائزہ لے لیا۔ انہوں نے خاں صاحب سے کہا... ”بھائی! کچھ مائیکروفون پر بولو گے؟ ہے۔“

حیران ہو کر خاں صاحب نے پوچھا۔ ”جی...... کیا؟“

”بھائی کبھی ریڈیو وغیرہ سنتے ہو؟“

”جی میرے پاس اپنا ریڈیو ہے۔“

”پھر تو ٹھیک ہے۔ اناؤنسمنٹ کرو گے؟“

”جی کر لوں گا۔“

یہ وہ پہلی چاٹ یا چسکا تھا جو خاں صاحب کے منہ کو لگا۔ جس الیکٹرانک میڈیا کے آخر میں مفتی جی خلاف تھے اس کا لپکا بھی مفتی جی نے ہی لگایا۔ ان کا خیال تھا کہ خاں کے ادبی کیریئر کو الیکٹرانک میڈیا کی سستی شہرت کھا گئی۔ نقصان، ان دونوں نے ایک دوسرے پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ڈرامے کی طرف خاں صاحب مفتی جی کو ورغلا گئے لیکن ایک بات جو مفتی میں بڑی قابل ذکر نظر آتی ہے، وہ یہ کہ مفتی جی نے کبھی قلم کاغذ کا ساتھ نہ چھوڑا۔

لکھنا لکھانا خاں صاحب نے بھی مکمل طور پر منقطع نہیں کیا لیکن ان کی توجہ زیادہ ”تلقین شاہ“ اور ٹیلی ویژن کی طرف ہو گئی۔ مفتی جی ڈرامے سے منسلک رہے لیکن ڈھیلے ڈھالے۔ انہوں نے کبھی ہمہ وقت اپنی ساری

توجہ ادھر مبذول نہیں کی۔

ان دنوں جب خاں صاحب مزنگ روڈ سے سائیکل پر آیا کرتے تھے، ان دنوں پاکستان میں مفتی جی کا قیام کرشن نگر میں سانده روڈ پر تھا۔ ان کے گھر کا نام Lovely Lodge تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ وہ جہاں بھی رہیں ان کے گھر کا یہی نام ہو۔ 1950ء تک وہ یہیں سانده میں قیام پذیر رہے۔ پھر جب پاکستان نے تراڑکھیل میں ایک ریڈیو سٹیشن کھولا تو مفتی اس کے موڈھی تھے۔ یہ ریڈیو سٹیشن بھارت کے پروپیگنڈہ کا جواب در جواب تھا۔ یہاں مفتی جی، یوسف ظفر اور خاں صاحب سکرپٹ تحریر کرتے جو اسی وقت تاج محمد صاحب، محمد حسین صدا کار ہوا کے سپرد کر دیتے۔

1951ء میں مفتی جی پنڈی آ گئے۔ ان کا گھر B-365 میں سینٹ میری کالج کے پاس تھا۔ اس دوران ان کا رابطہ خاں صاحب سے رہا اور میں ان کے دائرہ اثر سے دور رہی۔ پھر 1958ء میں وہ مشہور واقعہ ہوا۔ Deputation پر تھے۔ مفتی جی نے ایک اختلاف کی بنا پر اپنے افسر اعلیٰ کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں انہیں suspend کر دیا گیا مگر شہاب بھائی کی مدد آڑے آئی۔ انہیں کراچی میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں انہوں نے دو مرتبہ رہائش بدلی۔ پہلے وہ منگھوپیر کے قریب ناظم آباد میں پاک کالونی میں رہے، پھر بندر روڈ پر پلازہ سینما کے پاس کرائے کا مکان لے کر آباد ہو گئے۔

اس وقت ان کے پاس آپا اقبال اور ان کے بھائی رفیق بھی رہتے تھے۔ جب مفتی جی کراچی میں تھے تو ہم شہاب بھائی کے مہمان ٹھہرے۔ ہمارے ساتھ بچے اور تبت کے بستر تھے۔ بچے اور بستر باتھ آئی لینڈ چھوڑ کر ہم مفتی جی کے پاس پہنچے۔ مفتی جی نے ہمیں بچوں کے بغیر دیکھ کر کہا...... "وہ بچے کہاں ہیں؟"

"وہ مفتی جی...... وہ سو رہے تھے۔ ان کو ہم عفت کے چارج میں دے آئے ہیں۔"

"ہاں بھئی جب بڑے آدمی سواگت کرنے کو ملیں تو پھر مفتی کہاں یاد رہتا ہے؟"

"یہ بات نہیں مفتی جی۔ اسی نے ٹرین کے ٹکٹ بھیجے تھے۔ میں کیا کرتا؟"

"یہ بھی مجھے ہی دھونس دی جا رہی ہے کہ شہاب ہماری دوستی afford کر سکتا ہے اور آپ جیسے کرایہ نہیں دے سکتا۔"

اتنے میں آپا اقبال آ گئیں اور پوچھنے لگیں۔ "شفقو کھانا کھالو۔"

"ناں ناں...... ناں تم دال بھجیا کھلا دو گی۔ وہاں پتہ نہیں کیا ضیافت ان کا انتظار کر رہی ہو گی...... جب"

ہم کچھ دیر سہمے سے بیٹھے رہے۔ پھر مجرموں کی طرح اجازت لے کر باہر نکل آئے۔ مفتی جی نے تکلیف بھی گوارا نہ کی۔

1964ء میں ہی مفتی جی O.S.D. بنا دیئے گئے۔ یہ بھی شہاب صاحب کے توسط سے ہوا۔ سیٹلائٹ ٹاؤن میں کمرشل مارکیٹ کے قریب منتقل ہو گئے۔ ایک ہی سال گزرا تھا کہ انہیں حیدری چوک میں الاٹ کر دیا گیا اور وہ صدر کے Speech Writer بنا دیئے گئے۔ 1969ء میں وہ ریٹائر ہو گئے اور

ہو گیا۔

1978ء تک انہوں نے دو گھر اور بدلے۔ یہ دوران کی ملازمتوں کے لیے اہم نہیں ہے بلکہ اس دوستی اور ت مندی کا مظہر ہے جو مفتی جی کو شہاب بھائی سے ہو گئی تھی۔ شہاب بھائی اس وقت ثاقب سمیت اپنی بہن محمودہ اور کے پاس رہتے تھے۔

شہاب کے بہنوئی امین صاحب بہت اچھی سرکاری نوکری پر تھے اور وہ ہلو چل اور ثاقب کو بڑی توجہ سے تے تھے۔ یہاں مفتی جی ہر روز دو پان لے کر پہنچتے۔ کبھی یہ پان باہر ہی دے جاتے۔ کبھی شہاب صاحب سے مڈھ باقی تو ان کے ہاتھ میں تھما دیتے لیکن انہوں نے کبھی اندر بیٹھ کر شہاب صاحب سے گپ شپ کرنے کی کوشش ۔

امین بھائی ان سے گھل مل گئے۔ 1978ء میں گھر بنایا۔ یہ گھر ایک برساتی نالے کے پہلو میں ہے اور سٹریٹ پر واقع ہے۔ بقول مفتی جی انہوں نے اس گھر کی تعمیر میں چھنگلی انگلی برابر زور نہیں لگایا۔ روڑا، اینٹ، بجری سب حب کا درد سر۔ بنیادوں سے چھتوں تک ایک ایک سٹیج پر امین بھائی حاضر۔ دروازے لگے۔ پینٹ ہوئے۔ مفتی جی ہر۔

غرض یہ کہ یہاں بھی مفتی جی کو ان کے توکل کی جزا ملی۔ شہاب بھائی کی Wishing Well رنگ لائی۔ بھائی کا ایک یہ بھی فلسفہ تھا کہ اگر آپ کسی شخص کے لیے اچھے واقعات کی فقط آرزو ہی پال لیں تو عجب معجزانہ طریق ر دعا میں بدل جاتی ہے اور جس کے لیے آپ بہتری کی خواہش پالتے ہیں اس کے ساتھ خوشگوار واقعات ہونے ہیں۔

میں مفتی جی پر عقیل روحی اور ابدال بیلا جیسی کتاب تو نہیں لکھ سکتی۔ میں تو فقط یہ بتانا چاہتی ہوں کہ کس طرح ساتھ ان کا تعلق بیج سے پھلتا پھولتا ایک تناور درخت میں بدل گیا اور داستان سرائے کے در و دیوار کیسے ان کی محبت ہد بن گئے۔

داستان سرائے میں مفتی جی کبھی شہاب بھائی کے کمرے میں نہ ٹھہرے۔ یا تو برآمدے میں اپنا بیگ، پان، کے لوازمات رکھ کر ایک بازار سجا لیتے یا پھر اندر ڈرائنگ روم میں اس آخری دیوار کے ساتھ چارپائی لگا لیتے جس کے غسل خانہ ہے۔

میں ان سے جھگڑتی ''مفتی جی یہ کیا مذاق ہے۔ آپ پبلک کے لانگے میں کیسے آرام کر سکتے ہیں؟ اندر کمرہ ہے۔ آپ اس میں رہیں آرام سے۔ جب چاہیں جب دل کرے لکھیں، جب جی چاہے کھانا منگوا لیں۔''

وہ تھوڑا سا ہنستے اور پھر دونوں ہاتھ باندھ کر بولتے..... ''ناں بھئی ناں میں پلید آدمی۔ میرا شہاب کے کمرے سے کیا لینا دینا۔ مجھے تو اندر جھاتی مار کر بھی نہیں دیکھنا چاہیے۔''

میں نے جب پھر کوئی دلیل دینا چاہی تو وہ بولے۔ ''کاکی! میں سلسل البول کا مریض ہوں۔ پیشاب بغیر نوٹس جاتا ہے۔ سارے کپڑے بھیگ جاتے ہیں۔ یہ جگہ اچھی ہے۔ غسل خانے کا دروازہ ساتھ ہے۔ کھولا اور اندر۔''

میں پھر بھی مُصر ہوئی تو ان کا جواب آیا۔ ''کاکی! میرے ملنے والوں میں ہر قسم کے لوگ ہیں۔ میں تو بھی برآمدے کا دروازہ بند نہیں کرتا۔ ملاقاتی بلا جھجک آ جاتا ہے۔ احمد بشیر، پروین عاطف، مودی، نیلم..... عقیل ابدال بیلا، اسلام بی بی۔ اب کس کس کو گنواؤں..... میں تیری محبت کو سمجھتا ہوں لیکن اتنا تو سمجھ پاگل کہ تیری محبت تکلیف دے گی۔''

میں چونکہ اپنی تکلیف دہ محبت کا کچھ کچھ ادراک رکھتی تھی، اس لیے دلیل کے آگے میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

جب مفتی جی آخر آخر میں بہت بیمار ہوئے تو ایک دن خاں صاحب نے مجھ سے لجاجت سے کہا ''قدسیہ جی بہت بیمار ہیں۔ شفایاب ہونے کے امکانات نہیں ہیں۔''

''یہ کون وثوق سے کہہ سکتا ہے؟''

''پیشاب کی تھیلی ساتھ لٹکائے رکھتے ہیں۔ اوپر سے مسلسل کھانسی بھی ہے اگر.....''

وہ چپ ہو گئے۔ پھر کچھ لمحوں بعد بولے..... ''قدسیہ! جیسا دودھ کا کاڑھا تم مجھے پلایا کرتی تھیں اگر تم ویسا ہی پلا سکو تو؟''

بات ابھی بھی واضح نہیں تھی۔

''لیکن خاں صاحب! اس کا کاڑھا بنانے میں تو قریباً دو گھنٹے لگتے ہیں۔''

''ہاں وہ تو ہے۔''

''لیکن آپ چاہتے کیا ہیں؟''

''میں مفتی جی کو بلا کر یہاں رکھنا چاہتا ہوں۔ وہ اوپر سارا دن تخت پوش پر رہیں گے۔ رات کو میں انہیں منتقل کر دیا کریں گے۔ میں ایک طرح سے ان سے وعدہ بھی کر چکا ہوں۔''

معاملہ طے ہو گیا۔

مفتی جی آ گئے۔ دودھ میں چھوہارے ڈال کر ہلکی آنچ پر اتنی دیر پکایا جاتا کہ دودھ ایک تہائی رہ جاتا میں چھوہارے ملا کر دن میں دو تین مرتبہ مفتی جی کو پلایا جاتا۔ حکیم صاحب کے بتائے ہوئے کاڑھے نے مجرب پہلے کھانسی کے دورے کم ہوئے۔ آہستہ آہستہ کھانسی، بخار، بلغم سب غائب..... سب سے آخر میں وہ ہلکا ہلکا سے ان کی جان تو رُ رہا تھا، ختم ہو گیا۔

مفتی جی کے چہرے پر سرخی آ گئی۔ ٹیڑھے ٹیڑھے ہاتھ پاؤں سیدھے سبھاؤ چلنے لگے۔ مفتی جی پروگرام بنا لیا اور ہم دونوں کے اصرار کے باوجود وہ اسلام آباد چلے گئے۔ مفتی جی جب کسی چیز کا ارادہ کر لیتے کے ارادے کو متزلزل کرنا مشکل تھا۔

عقیل روبی اور ابدال بیلا نے مفتی جی پر بہت خوبصورت، انوکھی اور جامع کتابیں لکھی ہیں۔ ان مندوں نے اپنی محبت کے پھول ان کے چرنوں میں چڑھائے ہیں لیکن عکسی مفتی نے اس محبت میں اور ہی ہے۔ اس کا مضمون پڑھیے اور عکسی کے لگاؤ کا خود ہی اندازہ لگائیے۔

ممتاز مفتی کی یادیں

از عکسی مفتی

ہمیں چھوڑ جانے سے چند روز قبل ممتاز مفتی مجھ سے کہنے لگے۔

''یار عکسی! تیرے لوک ورثہ دا کیہ فائدہ! یار، یاد رکھنا جب میں مر جاؤں تو دو شہنائیوں والے اور ایک ڈھول والے کو بلا لینا اور گھر کے باہر خوب شادیانے بجانا۔ خوشی منانا۔ وعدہ کرو یار۔ ایسا ہی کرو گے۔''

والد سے کیا ہوا وعدہ تو میں نہ نبھا سکا۔

لیکن آج اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ہمیں ممتاز مفتی کا سوگ نہیں منانا چاہیے بلکہ انہیں celebrate کرنا چاہیے۔

So let us celebrate MUMTAZ MUFTHE

He was a gift to all us from ALLAH

مجھے یہ زعم تھا کہ ممتاز مفتی کے ہم رفقاء کو ذاتی طور پر جانتا پہچانتا ہوں اور پھر ان میں سے بیشتر تو میرے بھی ہیں لیکن یہ زعم ان کی وفات پر پاش پاش ہو گیا۔ سینکڑوں ہزاروں لوگ نہ جانے کہاں کہاں سے اُمڈ پڑے۔ اچھے خاصے عمر رسیدہ بزرگ دھاڑیں مار مار رو رہے تھے۔ کچھ چیخ چیخ کر پکار رہے تھے۔

''باپو باپو۔ میں یتیم ہو گیا۔''

میں حیرت سے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔

یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ یہ کیونکر یتیم ہو گیا؟ میں سوچتا رہا۔

میرا خیال تھا لوگ آئیں گے، مجھے سہارا دیں گے، گلے لگائیں گے۔ دلاسہ دیں گے۔ غم بانٹیں گے۔ الٹا مجھے سب کا دکھ بانٹنا پڑ گیا۔ اور تو اور وہ مولوی حضرات جنہوں نے ''لبیک'' کے چھپنے پر مفتی جی کے خلاف فتوے جاری کیے۔ کون ہے جو بیت المکرم کو ''کالا کوٹھا'' کہتا ہے۔ اس کی یہ جسارت کہ حج کا تمسخر اڑائے کہ ''کوٹھے والا مجھے آنکھیں دیتا ہے۔''

ان ہی میں سے ایک مولانا ممتاز مفتی کے قلم کو اسلام کی تلوار سے تشبیہ دینے لگا۔

میں حیرت سے سنتا رہا۔

اسی موقع پر جیب کترے بھی پیچھے نہیں رہے۔ جیب کتروں کا ایک پورا گروہ جنازے کے دوران ممتاز مفتی کے چاہنے والوں کو لوٹتا رہا۔ بہت سوں کی جیبیں کٹ گئیں۔

ایک صاحب جن کی جیب کٹ چکی تھی، فرمانے لگے: ''کیا مذاق ہے۔ ممتاز مفتی جاتے جاتے بھی ہاتھ دکھا گئے۔'' پاس ہی کھڑا احمد بشیر بولا: ''نہیں صاحب۔ ممتاز مفتی جاتے جاتے سب کو کچھ دے گئے۔ جیب نہیں اپنا دل ٹٹولیں

اور کہیں کہ میں غلط کہہ رہا ہوں۔''

ممتاز مفتی جیب کتروں کو بھی کچھ دے گئے ہیں۔

ممتاز مفتی کو بچپن سے اپنے گھر کے ماحول سے سخت نفرت تھی۔ جب ان کے والد مفتی محمد حسین نے شادی کر لی تو ممتاز مفتی کی والدہ صغراں بی بی کی حیثیت گھر میں نوکرانی کے برابر رہ گئی۔

اپنے والد کے خلاف شدید غم و غصہ تھا۔

گھر چھوڑ کر چلے گئے۔

کتنے ہی برس، کئی سال بیت گئے۔ والد مفتی محمد حسین نوے برس کو پہنچے لیکن ممتاز مفتی نہ ان سے ملنے

وہ ایسے ہی اگر کبھی کسی سے روٹھ جاتے تو برسوں بات نہ کرتے۔ بہت غصے والے تھے۔

بڑی بڑی خطائیں معاف کر دیتے لیکن کسی چھوٹی سی بات پر روٹھ جاتے۔

ایف اے اور بی اے میں انگریزی امتحان میں ہمیشہ فیل ہوتے رہے۔ کہتے تھے تعلیم نے میرا کچھ نہیں

لیکن 1935ء میں بطور انگلش ٹیچر ملازم ہو گئے۔

سکول میں انگریزی پڑھانے لگے۔

Recession کا دور تھا۔ چالیس روپے تنخواہ پائی۔

باپ انسپکٹر آف سکولز تھا۔ کسی نے یوں ہی چھیڑ دیا۔ مفتی سفارشی ہے۔ باپ نے کہلوا بھیجا۔ گھر

بس اسی دن سکول سے استعفیٰ دے دیا۔ نوکری چھوڑ کر چلے گئے۔ شہر ہی چھوڑ دیا۔

ممتاز مفتی باغی تھے۔ والد، گھر بار، رشتہ دار، عزیز و اقارب سب کو چھوڑ چکے تھے۔ کسی رشتہ دار کی

ممتاز مفتی کو ملے۔ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ جس قدر باپ سے نفرت تھی، اسی قدر مجھ سے پیار تھا۔ کہتے

تمہارا کوئی تایا ہے نہ پھوپھا۔ نہ ماما ہے نہ چاچا۔ بس ایک میں ہوں تمہارا ابا۔ میں ہی تمہارا دوست اور میرے

بھی تمہارے دوست ہیں۔ والد سے نفرت اب پورے معاشرے کو لپیٹ میں لے چکی تھی۔

اسی دور میں ممتاز مفتی نے گہما گہمی، چپ اور ہمارائیں جیسا ادب تخلیق کیا۔ وہ نفسیاتی افسانے جسے

کہانیاں'' بھی کہتے ہیں، دراصل ممتاز مفتی کی معاشرے کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔ معاشرے کی گھٹن، رسم

پابندیاں اور گرامر و زبان کی قیود کے خلاف۔ ممتاز مفتی کی شخصیت کے ارتقاء کا یہ اہم دور تھا۔

وہ صرف جنسی حوالے سے فرائیڈین نہ تھے بلکہ Hatred father جو فرائیڈ کے فلسفے کا اہم ستون ہے

پورا پورا لاگو ہوتا ہے۔

ان کی شخصیت میں تضاد ہی تضاد تھا۔

غصیل اور باغی ہونے کے باوجود ممتاز مفتی شرمیلے تھے، ڈرے ڈرے، سہمے سہمے، خوف زدہ، احساس

کمتری کے شکار۔

کبھی کسی بڑے افسر سے نہ ملتے۔

دفتر میں چپڑاسیوں اور کلرکوں کو دوست رکھتے۔ انہیں یار کہتے۔ انہیں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے۔
افسر سے خوف یا پھر شدید غصہ رکھتے۔
ایک افسر کو گھونسہ مارنے پر کئی سال معطل رہے۔
پیشاب کی حاجت ہو تو کبھی Officers' Toilet نہ جاتے۔ Staff Toilet تلاش کرتے ہمیشہ یا باہر کسی کونے میں بیٹھنا گوارا کر لیتے۔

1950ء کے لگ بھگ ممتاز مفتی میں تبدیلی آ گئی۔ اب وہ ایک مشہور افسانہ نویس تھے اور ریڈیو پاکستان میں سکرپٹ رائٹر کام کرتے تھے۔ مختار صدیقی، مسعود قریشی، اشفاق احمد، یوسف ظفر، باقی صدیقی، محمد حسین ان کے ہم عصر تھے۔

فطرت تو نہ بدلی۔ وہی شدت، وہی غصہ، طبیعت کا تضاد اور احساس پن تو ویسا ہی رہا لیکن رخ بدل گیا۔
نہ جانے کسی بابے کی دعا تھی یا کسی بزرگ کی نگاہ یا خود قدرت اللہ شہاب کا چمتکار۔ یہ تو میں نہیں جانتا لیکن تبدیلی آئی۔

ممتاز مفتی کی تلاش ذات نے رخ تبدیل کر لیا۔ شخصیت کی صفات تو نہ بدلیں البتہ ارتقاء نے ایک دوسری شکل اختیار کر لی۔ ایک نیا راستہ اپنا لیا۔ پھر ممتاز مفتی بابوں اور خانقاہوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ **عقیدت کی دلدل میں** دھنستے چلے گئے۔

لیکن اس سفر میں ہر موڑ پر قدرت اللہ شہاب سے ان کے گہرے مراسم یا خط و کتابت رہی۔ آہستہ آہستہ ممتاز مفتی کی شدت مجذوبانہ رنگ اختیار کرتی گئی۔ ممتاز مفتی مجذوب ہو گئے۔
شکر ہے خدا کا کہ پورے پورے مجذوب نہ ہوئے لیکن کسی درجہ ایسے ہی جیسے نارنجی میں کچھ کچھ مالٹے کا ذائقہ ہوتا ہے۔ ممتاز مفتی میں بھی ایک مجذوب تھا۔
اسی دور میں ممتاز مفتی نے ''لبیک'' اور ''الکھ نگری'' جیسا ادب تخلیق کیا۔ خانہ کعبہ کو کالا کوٹھا یا اللہ کو کوٹھے والے سے تشبیہ دینا کسی مجذوب کی تحریر تو ہو سکتی ہے، ہوش مند ادیب کی نہیں اور کسی مجذوب ہی کو یہ قبولیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ گستاخانہ باتیں لکھے اور صاف بچ نکلے۔
آپ اور میں پورے ہوش میں ایسی تحریر نہیں لکھ سکتے۔

پھر ایک دن اچانک قدرت اللہ شہاب چل بسے۔ ممتاز مفتی کے خواب ادھورے رہ گئے۔ عقیدت کے وہ تانے بانے جو ممتاز مفتی نے قدرت اللہ شہاب کی ذات کے گرد بُن رکھے تھے، ٹوٹ گئے۔ بے محل وقوع بے جہت ہو گئے۔ وہ نئی کرن، پاکستان کا عروج جس کا ممتاز مفتی کو یقین تھا کہ وہ قدرت اللہ شہاب کی زندگی ہی میں حقیقت بن جائے گی، بکھر کر رہ گئی۔ ممتاز مفتی کا مدار چھن گیا۔
قدرت اللہ شہاب کے مرنے کے چند ہی سال بعد ممتاز مفتی کا محبوب بیٹا عکسی مفتی گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ عکسی نے دوسری شادی کر لی۔ ممتاز مفتی کو دوسری شادی سے سخت چڑ تھی۔ اس نے اپنے والد کو کبھی معاف نہ کیا تھا۔ بیٹا دوسری شادی

کرتے ہی گھر چھوڑ گیا تو ممتاز مفتی بالکل تنہا رہ گیا۔ تن تنہا۔ اس کی نفرت بے معنی ہو کر رہ گئی۔

اس کی موج در موج محبت اور عقیدت کا نہ کوئی ساحل رہا نہ کنارا۔

وہ اکیلا تن تنہا Old man & the Sea کی طرح چپو مار مار کر اپنی کشتی ٹھیلتا رہا۔ اس میں زندگی کی اُمنگ اب بھی باقی تھی۔

آخری سانس تک ممتاز مفتی کی آنکھوں میں چمک تھی۔ قلم میں تلوار جیسی کاٹ تھی۔ وہ علی پور کا ایلی تھا۔ بار... اس کا شیوہ نہ تھا لیکن اب مفتی دھیما پڑ چکا تھا۔ مجذوبیت رنگ بدل کر فقیری میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ایک بوسیدہ بستر پر رہتا یا پھر رنگین ٹکڑیوں والی رلی پر بیٹھ کر کچھ لکھتا رہتا۔ کچھ سوچتا رہتا۔

لوگ یوں ہی کھچے چلے آتے۔ لوگوں کی سیوا اس کا مسلک بن چکا تھا۔ ایک گھنے درخت کی طرح اس کا سایہ دور دور پھیل چکا تھا لیکن اس کی تلاش ختم نہ ہوئی۔ حالانکہ وہ بہت تھک چکا تھا۔ اس کی آرزو جوان تھی۔ اس کی جستجو میں چمک تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا نہ تھا۔ اس کا سفر جاری تھا۔

''قفس میں لامکاں کی آرزو رکھتا
نوے برس سال، آخر ٹوٹ جاتی ہے
گئے ممتاز مفتی جی
ازل سے تا ابد پھیلی
کہانی رو پڑی ہے۔''

ممتاز مفتی کی زندگی دراصل ایک طویل تلاش ہے۔ ان کی آخری تصنیف کا نام بھی ''تلاش'' ہے۔ 1905ء سے لے کر 1945ء تک جو کچھ ان پر بیتا اس کا نام ''ایلی'' رکھا۔ یہ پہلا حصہ ممتاز مفتی کی عالمِ شہادت کی روئیداد ہے۔ ''علی پور کا ایلی'' تلاشِ ذات کا ناول ہے۔

1950ء سے 1990ء تک کی آپ بیتی کو ''الکھ نگری'' کا نام دیا۔ یہ دوسرا حصہ ممتاز مفتی کا عالم الغیب کا سفر ہے۔ ''لبیک'' اور ''الکھ نگری'' دراصل تلاشِ خدا کی روئیداد ہے۔ دونوں ہی ممتاز مفتی کی تلاش ہیں۔ وہ مشاہدات جن میں سے ممتاز مفتی گزرا اور جن کی بدولت ''مفتی'' ''ممتاز'' ہو گیا اور دونوں تصانیف میں بلاشبہ بہت تضاد ہے۔

''علی پور کے ایلی'' کے دھواں دھار اندھیرے آنے والی کرن کو مزید چمک بخشیں گے۔ ایلی کے اندھیرے ''الکھ نگری'' کے چمکیلے خواب ایک دوسرے سے جس قدر مختلف ہیں، اسی قدر ممتاز مفتی کی شخصیت کے ارتقاء کی اہم ... ہیں۔ یہ ایک ہی عمل کے دو Aspects ہیں، دو رخ ہیں۔

اس عمل کے دوران کئی شخصیات، کردار، روحانی بابے، بزرگ، عامل پروفیسر حتیٰ کہ خود قدرت اللہ شہاب سنگِ میل تو ضرور ہیں منزل نہیں۔ ممتاز مفتی کا سفر یہاں ختم نہیں ہوتا، جاری ہے۔

ممتاز مفتی کی تلاش جاری ہے۔

ان کی وفات کے بعد ایک لڑکی نے فیصل آباد سے مجھے خط لکھا۔ لکھتی ہیں:

''ممتاز مفتی کبھی مر نہیں سکتے۔ آج بھی وہ اپنی تحریروں کے اندر زندہ ہیں۔ اپنے جذبے کی پوری سچائی کے اپنی خوبصورت عقیدت کے ساتھ۔ ان کی تلاش بھی ان کی طرح ہی خوبصورت تھی۔ ان کو خدا ملا یا نہیں، یہ تو وہ جانتے تھے یا شاید آپ؟ مگر میری تمنا تھی کہ کاش خدا کہیں میرے پاس ہوتا تو میں انہیں دے دیتی۔''

اب سے بہت سال پہلے کی بات ہے جب میں گارڈن کالج میں پروفیسر تھا۔ ایک روز کالج کے چند طالب علم میرے گھر آئے اور ممتاز مفتی سے کہنے لگے۔ ''اچھا تو آپ عکسی مفتی کے باپ ہیں۔''

یہ سن کر میرے والد کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

اسی شام اپنے ایک دوست سے کہنے لگے۔

''یار! آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میرے تو وہم و گمان میں نہ تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ لوگ ممتاز کو بیٹے کے حوالے سے پہچانیں گے۔''

بس مجھے موقع مل گیا۔ میں نے کہا۔ ''والد صاحب! اب پتہ چلا جو دل کو لگی۔ آخر میرا حوصلہ دیکھیں بچپن سے آپ ہی کے نام سے پہچانا جاتا ہوں۔ کالج میں پروفیسر ہوں، شعبہ نفسیات کا سربراہ ہوں، کئی قسم کے پاکھنڈ کرتا ہوں لیکن پھر بھی لوگ یہی کہتے ہیں ممتاز مفتی کا بیٹا۔''

بات کو جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا ''سر! پچھلے 38 برس میں نے زندگی آپ کی طرز پر گزاری ہے۔ اب میں اپنے طور پر رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے اجازت دیں۔''

ممتاز مفتی نے تھوڑی دیر سوچا اور کہنے لگے۔ ''جاؤ عکسی! اجازت ہے۔''

اسی دن میرا اور ممتاز مفتی کا راستہ الگ ہو گیا۔ اب میں 52 برس کا ہوں۔ کئی سال گزر چکے ہیں لیکن آج مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں ممتاز مفتی کا بیٹا ہوں۔ ممتاز مفتی ہی میری پہچان ہے۔ ممتاز مفتی ہی میرا ورثہ ہے۔ اس سے بڑھ کر میرے لیے اور کوئی اعزاز نہیں۔

کچھ تو لوگوں نے مفتی جی کو جانا پہچانا اور پھر آپ تک پہنچایا۔ کچھ حسن اتفاق سے مفتی جی نے عرفانِ ذات میں ڈوب کر اپنا اتہ پتہ اور سراغ لگایا۔ اس سلسلے میں مفتی جی نے جو مضمون لکھا، وہ بھی پیش خدمت ہے۔

ایک ذاتی خاکہ

اس وقت اپنا یہ عالم ہے کہ اعضاء بے رحمی کے محکمے کو آوازیں دے رہے ہیں۔ کہتے ہیں 86 سال سے ہم دن رات ٹک ٹک کر رہے ہیں، نہ کبھی جمعے کی چھٹی ملی ہے نہ عید شب برات کی۔ اب بس کرو بہت ہولیا، ہم پر ظلم بند کیا جائے۔

نتیجہ یہ ہے کہ میں پلیٹ فارم پر بیٹھا انتظار کر رہا ہوں کہ کب گاڑی آئے اور میں آپ کو ٹاٹا کر کے رخصت ہو جاؤں۔ جناب والا! میری تحریر اور شخصیت کے متعلق چند خوش فہمیاں چل نکلی تھیں۔ سوچا رخصت ہونے سے پہلے احوال واقعی قلم بند کر جاؤں۔ حال ہی میں مَیں نے اپنی تحریر اور شخصیت پر ایک مضمون لکھا تھا جس سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں۔ عنوان ہے چھوٹا۔

ممتاز مفتی کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے، سیانے کہتے ہیں، دو جگہوں سے دیکھو تو ٹھیک سے نظر نہیں آتا۔

دور سے!

بہت قریب سے!

چونکہ میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے، اس لیے مضمون سند نہیں ہے۔

مفتی کو ادیب ہونے پر فخر نہیں ہے بلکہ معذرت ہے۔ اس نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ ادیب بنے۔ اتفاق سے بن گیا۔ تالی بج گئی۔ یوں زندگی بھر لکھنے پر مجبور کر دیا گیا۔

اسے اردو زبان نہیں آتی۔ اس کی تحریر کی Roots اردو ادب میں نہیں ہیں۔ اس نے کبھی شعوری طور پر ادب کے لیے نہیں لکھا۔ اس نے اردو ادب پر کوئی احسان نہیں کیا نہ ادب کی خدمت ہی کی ہے۔ الٹا اہلِ ادب نے مفتی پر احسان کیا ہے۔ اسے ادیب کا مرتبہ بخشا، اہمیت عطا کر دی۔ زندگی بے مصرف نہیں رہی۔

اس کے گھر میں کسی کو ادب سے خصوصاً اس کی تحریروں سے دلچسپی نہیں ہے۔ بیٹے میں بڑی صلاحیت تھی پر اس نے کہا میں خود! میں خود! جیسے جان دار ضدی بچے کہا کرتے ہیں مطلب تھا، میں اپنا راستہ خود تلاش کروں گا۔ بنے ہوئے راستے پر چلنا گوارا نہیں۔ یہ تو بیٹے کا باپ سے تعلق ہے۔ بیوی کہتی ہے، کیوں جھوٹی کہانیاں لکھ کر اپنی عاقبت خراب کرتا ہے۔ اب بھی توبہ کر لے۔

دوست کہتے ہیں، تجھے تو سچ کے زعم میں خود کو سرِ بازار رسوا کرنے کی لت پڑی ہوئی ہے۔ نہ نہ نہ ہمیں دور ہی رکھنا، خبردار ہمارا تذکرہ نہ کرنا۔

مفتی ازلی طور پر اکیلا ہے۔

اکیلے دو قسم کے ہوتے ہیں۔

ایک وہ جو جان بوجھ کر التزاماً الگ رہنا پسند کرتے ہیں۔ محفل لگ جائے تو ڈوبتے نہیں تیرتے رہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو محفل سے گھبراتے ہیں، کتراتے ہیں۔ لگ جائے تو ڈوب جاتے ہیں۔ مفتی دوسری قسم کا ہے۔ اگر آپ مفتی کو ایک کمرے میں بند کر دیں جہاں اس کی ضروریات اسے ملتی رہیں تو بے شک چھ مہینے کے بعد دروازہ کھولیں مفتی یوں ہشاش بشاش بیٹھا ہوگا جیسے ابھی ابھی روز گارڈن کی سیر کر کے آیا ہے۔

دروازہ بجے تو مفتی کا دل ڈوب جاتا ہے۔ کوئی آ گیا، ظاہر ہے جو ڈرتا ہو کہ کوئی آ نہ جائے تو مہمان نوازی کیسے کرے گا۔

مفتی نے کسی مہمان کو کبھی ٹھنڈا یا گرم نہیں پوچھا۔ جب مہمان چلا جاتا ہے تو اسے یاد آتا ہے کہ افوہ ٹھنڈا گرم تو پوچھا ہی نہیں، یاد ہی نہیں رہا۔ انگریزی میں ایک مثال ہے جس کا پنجابی میں ترجمہ یوں ہوگا۔ ''ٹریا نہ جائے تے پچھے گوڈیاں دا۔'' لوگ انتظار کرتے ہیں کہ کب مہمان آئے اور وہ کھانا کھائیں۔ مفتی انتظار کرتا ہے کہ کب مہمان جائے اور وہ کھانا کھائے۔ مفتی کو غصہ بہت آتا ہے۔ وہ غصہ جو بھوت بنا دیتا ہے، دھول اڑاتا ہے، سدھ بدھ رہنے نہیں دیتا۔

عرصہ دراز ہوا کہ اس نے جان لیا تھا کہ غصہ ایک خنجر ہے جو انسان اپنے ہی دل میں بھونک دیتا ہے۔ دوسرے پر خود کو سزا دینے کا نام ہے، خود کو چاٹی میں ڈال کر بلونے کا عمل ہے۔ جان لینے کے باوجود، مان لینے کے باوجود وہ خود کو چاٹی میں ڈال کر بلونے پر مجبور ہے۔ صاحبو! ہائے کیا چیز بے بسی ہوتی ہے۔ عورت کے متعلق ممتاز مفتی کا بیٹھا ہے جسے انگریزی میں Love-hate relationship کہتے ہیں۔ مفتی میں ریڈار قسم کا ایک ریسیور لگا ہوا قرب و جوار میں کوئی عورت آ جائے تو وہ ٹک ٹک کرنا شروع کر دیتا ہے اور اگر وہ بانکی نار ہو تو ٹھاوں ٹھاوں کرتا ہے۔

مفتی کو ہر راہ چلتی عورت سے عشق ہے۔ بلا لحاظ جسم، خدوخال اور سٹیٹس۔ گورے رنگ پر تو اس کی جان نکلتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر خاتون زیادہ ہی قریب آ جائے تو وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ اٹھتا ہے۔ یہ ''لو ہیٹ ریلیشن شپ'' اس ہوا کہ بچپن میں جس خاتون سے وہ شدت سے متاثر ہوا وہ اس کی سوتیلی ماں تھی۔ وہ بڑی حسین اور بارعب خاتون

ممتاز مفتی نے بڑی محبتیں کی ہیں لیکن بڑی دیر کے بعد اسے اس حقیقت کا شعور ہوا کہ دراصل اسے محبت کرنے سے محبت تھی۔ اس کیفیت سے محبت تھی، محبوب سے نہیں۔ محبوب کی حیثیت تو ضمنی تھی۔

اس کے نزدیک محبوب میں چند اوصاف کا ہونا لازم ہے۔ خدوخال اہم نہیں، رنگ گورا ہو، عمر رسیدہ ہو کہ نیار جسم ابھرا ہو، سب سے اہم بات یہ ہے کہ محبوب میں ہرجائیت کی واضح دھونس ہو۔

مفتی کسی نیک یا وفا شعار خاتون سے محبت نہیں لگا سکتا۔ آج کل کی لڑکیاں اسے اپیل نہیں کرتیں، کہتا ہے محبت فن ہے، یہ آج کل کی کھٹی مٹھی لڑکیاں کیا جانیں کہ محبت کیا چیز ہے۔ مفتی کے نزدیک محبت میں ممتا کا ہونا ضروری ہے۔ ممتا بھرے لگاؤ کے ساتھ ہرجائیت کی دھونس ہو تو سبحان اللہ۔

اسے طوائف قسم کی عورت سے بڑی دلچسپی ہے کہ طوائف تن کے تقاضے سے آزاد ہو چکی ہوتی ہے۔ صرف من کی بھوکی ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کی کہانیوں میں طوائف کا بڑا تذکرہ ہوتا ہے۔

اللہ میاں سے مفتی کے تعلقات ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ بچپن میں وہ اللہ سے خوفزدہ رہتا ہے۔ سمجھتا رہا تھا کہ اللہ نے ایک بھٹی جلا رکھی ہے اور اس کا من بھاتا شغل یہ ہے کہ لوگوں کو اس بھٹی میں جلائے۔

پڑھ لکھ گیا تو اللہ سے منکر ہو گیا اور مذہب پر شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ جیسے آج کے ہر پڑھے لکھے کا وطیرہ ہے۔ پھر پتہ نہیں ایک بزرگ نے کیا کیا اس کا رخ بدل گیا۔ اسے ڈال ڈال پات پات میں اللہ نظر آنے لگا۔ اسے اللہ سے جنون عقیدت پیدا ہو گئی۔ اللہ سے یارانہ لگ گیا۔ پھر اس پر حیرت طاری ہو گئی کہ اللہ اس پر اس قدر مہربان کیوں ہے۔ قدم قدم پر کرم نوازیاں کیوں کرتا ہے۔ مفتی میں عقیدے کا فقدان ہے۔ عقیدت کی بھرمار ہے۔ قدرت اللہ شہاب کو عمر بھر شکایت رہی کہ وہ مفتی کی عقیدت کا شکار ہے، اس لیے مظلوم ہے۔

1990ء میں دفعتاً مفتی کی نگاہ سے پردہ ہٹ گیا اور اسے حقیقت کی پہلی جھلک نظر آئی۔ وہ یہ جان کر حیران رہ گیا کہ اسلام واحد مذہب ہے جو کہتا ہے، دیکھو سمجھو، غور کرو، عقل کو کام میں لاؤ۔ حقیقت پسند بنو۔ علم بدنصیب ہے۔ جب کبھی اللہ سے منکر تھا، اب عقل نہیں رہی تو اللہ کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ ممتاز مفتی شدت کا مارا ہوا ہے۔ اس کی شدت کا قوام

کچھ زیادہ ہی گاڑھا ہے۔

کہتے ہیں ایک عالم حکیم کی دکان پر گیا۔ کہنے لگا آپ کے پاس شیرا ہے۔ حکیم بولا، جناب شیرا تو ہے۔ [illegible] گاڑھا نہیں۔

مفتی کی شدت شین والی نہیں ش وے والی ہے۔ زندگی بھر اس کے دوستوں کو اس کی شدت کے [illegible] پڑے۔ شہاب نے کہا، مفتی کی دوستی پھوڑے جیسی ہے، جس کی ٹیسوں میں لذت ہے۔ اشفاق احمد بولا نہیں [illegible] سی سی کرتا رہا۔ احمد بشیر ہنساتا اور قہقہے لگاتا رہا چونکہ وہ خود شدت سے لت پت ہے۔ بانو نے کئی بار کچھ کہنے [illegible] کھولا، لیکن ممتاز نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پروین کے لیے شدت کے کولہو میں پسنا کوئی نئی بات نہ تھی۔ [illegible] "مفتی میں صرف شدت ہی نہ تھی، وہ شدت کو اک وصف سمجھتا رہا، اسی پر ناز کرتا رہا۔" سمجھتا رہا کہ جس میں شدت [illegible] میں خلوص ہے، ٹھنڈے میٹھے کرداروں سے الرجک رہا۔ اکاسی سال کا ہوا تو اس نے پہلی مرتبہ جانا کہ شدت [illegible] عیب ہے اور زندگی ٹھنڈے میٹھے لوگوں کے دم سے ہری بھری ہے۔

مفتی نے اس حقیقت کو جان لیا سچے دل سے مان لیا کہ شدت ایک عیب ہے ایک رکاوٹ ہے لیکن [illegible] اپنا نہ سکا۔ چونکہ شدت اس کی ہڈیوں میں رچی بسی تھی۔

صاحبو! کسی چیز کو جان لینا سچے دل سے مان لینا لیکن عملی طور پر اپنا نہ سکنا یوں ہے جیسے پھانسی پر لٹک [illegible] رہے۔ کاش کہ وہ شدت کو وصف ہی سمجھتا رہتا۔

دوستو! سچی بات یہ ہے کہ میں نے ممتاز مفتی جیسا خوش قسمت شخص نہیں دیکھا۔ اونہوں! خوش قسمت [illegible] ایک نئی ڈیول ہے۔

اس نے بڑی Rich بڑی بھرپور زندگی گزاری ہے۔ اللہ نے اسے بہت کچھ اور بن مانگے دیا [illegible] اللہ نے اسے کئی ایک لعنتوں سے بچائے رکھا۔ امارت سے بچائے رکھا، اقتدار سے بچائے رکھا، عہدے [illegible] ذاتی اہمیت کے احساس سے بچائے رکھا۔

کئی ماراں وٹی کے بزرگ حاجی رفیع الدین نے 1930ء میں سچ کہا تھا۔ کہنے لگے، جوانی میں [illegible] بدنامی ہوگی، رسوائی ہوگی لیکن بعد میں آپ کو بڑے اچھے لوگ ملیں گے۔ واقعی مفتی کو زندگی میں بڑے اچھے [illegible] ملے۔

اگر آج اللہ میاں ممتاز مفتی کے روبرو آ کھڑے ہوں اور کہیں...... "مانگ کیا مانگتا ہے" تو سوچ [illegible] گا، کیا مانگوں۔ جسے زندگی بھر بن مانگے ملا ہو، وہ بھلا کیا مانگے۔ اب تو وہ تکمیل کی خوشی میں سرمست پلیٹ فارم [illegible] انتظار کر رہا ہے کہ کب گاڑی آئے اور کب وہ آپ کو "ٹاٹا" کہہ کر رخصت ہو جائے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میں نے "مرد ابریشم" لکھی تو سچ کے داعی مفتی جی نے اس کتاب کو پڑھ کر [illegible] کا اظہار کیا۔ کہنے لگے "قدسیہ...... تو نے بڑی سچی سی کتاب لکھی ہے۔"

''کیا مطلب مفتی جی؟''

''تو نے شہاب کی شخصیت، اس کی بڑائی کو بے نقاب کرنے کے بجائے اپنے بچوں کا قصیدہ لکھا ہے۔ بچوں کو Build کرنے کی کوشش میں لگی رہی ہے۔''

''اس لیے مفتی جی! کہ میں سنی سنائی کا بندہ ہوں۔ میں نے مفتی جی، شہاب بھائی کو خاں صاحب کی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ میں شہاب صاحب کے ناخن کاٹنے والا نائی ہوں جسے عام زبان میں خلیفہ کہتے ہیں۔ بچوں کی اہمیت بھی ان سے زیادہ تھی۔ خاص کر اثیر خاں کی..... اگر.....''

لیکن مفتی جی نے سننے سے انکار کر دیا۔ جو وہ سچ سمجھ بیٹھتے اسی پر اڑے رہتے۔ اب جب وہ دنیا میں نہیں ہیں تو میرا نظریہ کچھ اور ہو گیا ہے۔ میں ان سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ مفتی جی! اگر شاعر محبوبہ کی تعریف کے قلابے ملائیں تو حق بجانب، بڑا شاعر اور اگر وہی شاعر وطن کی محبت کے گن گائے، نعت یا مرثیہ کہے، ماں کی محبت، اولاد کی فریفتگی میں رطب اللسان ہو تو ادب میں کمتر جگہ پائے۔ یہ تو ایک طرح سے فرائیڈ کو درست ثابت کرنے کی کوشش ہوئی۔

اب کیا کروں میرے پاس تو اب صرف وہ خط رہ گیا جو انہوں نے خاں صاحب کے پرنٹ میڈیا سے اُکھڑ کر Visual میڈیا میں گھس جانے پر لکھا۔

داستان گو اور اشفاق احمد

گذشتہ چند ایک سال سے داستان گو نے اودھم مچا رکھا ہے۔ وہ جگہ جگہ مجمع لگائے کھڑا ہے۔ ٹی وی پر، ریڈیو پر ادبی جریدوں اور محفلوں میں، ثقافتی اور سماجی ''گٹ ٹوگیدرز'' میں، شہروں میں، قصبوں میں، دیہات میں ان دور افتادہ مقامات پر جہاں ٹرانسسٹر کی رسائی ہے۔

عوام ریڈیو پر بڑے اہتمام سے اس کے پروگراموں کا انتظار کرتے ہیں۔ اس کی پھلجھڑیوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اس کی ''ہم اُلٹے'' ''بات اُلٹی'' پر حیران ہوتے ہیں۔ جوان اثر سے بھیگ جاتے ہیں۔ دانشور کچھ عرصے کے لیے بھول جاتے ہیں کہ ان کا کام محظوظ اور متاثر ہونا نہیں بلکہ مین میخ نکالنا ہے۔ نقاد گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں کہ کوئی انہیں مسکراتے ہوئے دیکھ نہ لے۔

بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ باتوں کے جال بُن کر مجمع لگانے والا، مجمع میں رنگینی کی رو دوڑانے والا، ہنسنے ہنسانے والا داستان گو درحقیقت گونگا ہے، ازلی گونگا۔ اس کی شخصیت دکھ اور چپ کے تانے بانے سے بنی ہے۔ اس کی بزم آرائی اور زعفران زاری شخصیت کے دو بنیادی عناصر دکھ اور چپ سے فرار کی سعی پیہم ہے۔ اس فطری جبر و قہر کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ ایک ردعمل، ایسا ردعمل جس کے تحت پودے کشش ثقل کی زنجیروں کے خلاف احتجاجاً پھوٹتے ہیں۔ اُگتے ہیں، بڑھتے ہیں، ابھرتے ہیں۔

داستان گو کی تمام تر زندگی اس عمل اور ردعمل کا ایک پیہم چکر ہے۔ ایک عظیم بھنور جس میں وہ ڈبکیاں کھاتا رہتا ہے۔ ڈوبتا ہے، ابھرتا ہے۔ پھر ڈوب جاتا ہے۔ مجمع صرف اس کے ابھرنے کا تماشہ کرتا ہے۔ اس کی مد کے